POWERED BY WORDPRESS | THEME BY MG12 | VALID XHTML 1.1 AND CSS 3
Log in

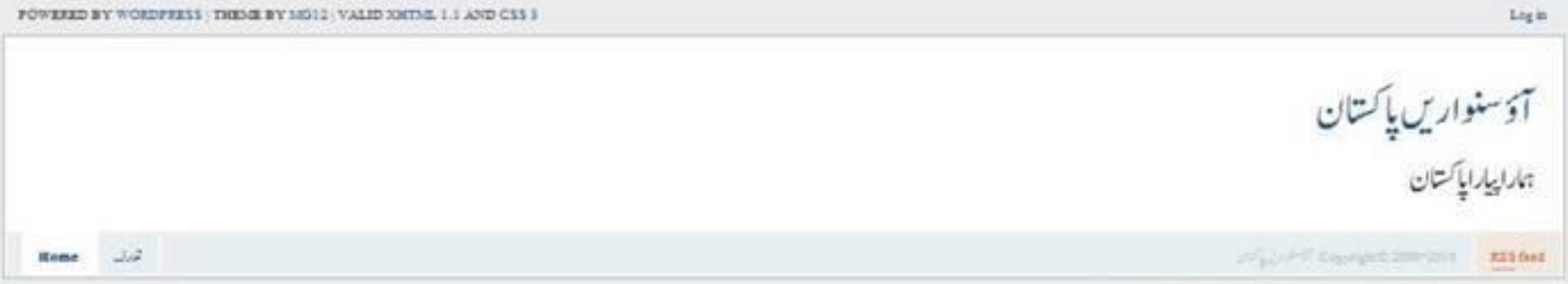

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہفتہ بلاگستان

GOSHA-E-BLOGGERS
گوشہ بلاگرز
URDU LIBRARY

تعارف
بچپن کے دن
یادِ رفتہ
تعلیم
یوم پکوان
ٹیگ ہی ٹیگ
کچھ تصاویر اِدھر اُدھر سے

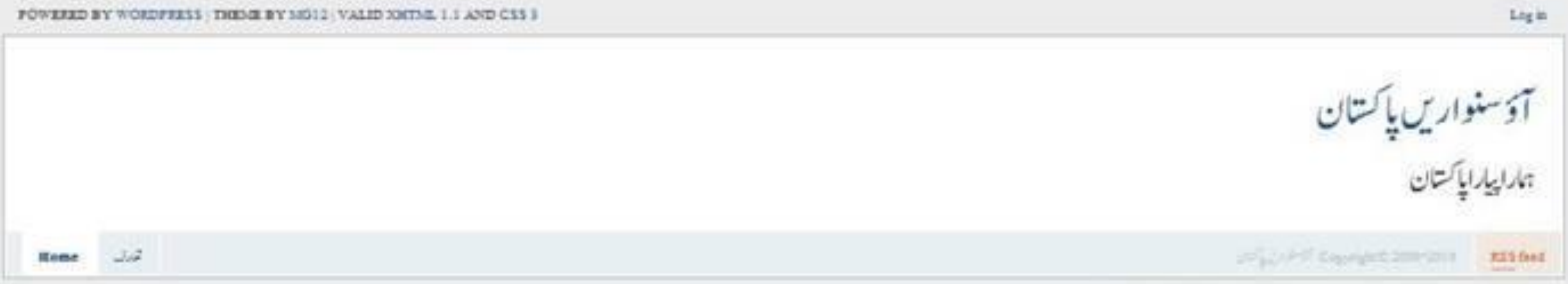

تعارف

نام یا نک :

محمد خرم بشیر بھٹی

آپ کے بلاگ کا ربط اور بلاگ کا نام یا عنوان؟ بلاگ کا عنوان رکھنے کی کوئی وجہ تسمیہ ؟

بلاگ کا ربط تو یہی ہوا جہاں آپ یہ تحریر پڑھ رہے ہیں۔

عنوان ہے "آؤ سنواریں پاکستان"۔

وجہ تسمیہ یہ کہ کوئی تین برس قبل یہ ڈومین رجسٹر کروائی تھی۔

ارادہ تھا کہ پاکستان کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی موضوعات پر تبادلہ خیال کا ایک پلیٹ فارم بنایا جائے۔

تین برس بعد وہ پتھر تو بنا چومے چھوڑ دیا لیکن اتفاقاً بلاگ کی دُنیا سے شناسائی ہوئی تو سوچا کہ

اس طریق پر بھی اپنی بات پہنچائی جاسکتی ہے۔

وگرنہ دل کا غبار تو نکالا ہی جاسکتا ہے۔

آپ کا بلاگ کب شروع ہوا؟

6 جولائی 2009 کو

آپ اپنے گھر سے کون سے ایک، دو یا زائد لوگوں کو بلاگنگ کا مشورہ دیں گے یا دے چکے ہیں؟

میں اتنا احمق نہیں جتنا دکھتا ہوں۔ کچھ باتیں گھر کی چار دیواری کے اندر ہی رہیں تو بہتر ہے۔

ایسے موضوعات جن پر لکھنے کی خواہش ہے مگر ابھی تک نہیں لکھ سکے یا آئندہ لکھنا چاہیں؟

ایسی تو کوئی بات نہیں۔ جس وقت جو دل میں سمائے لکھ ڈالتا ہوں

سوالحمد للہ نہ کوئی حسرت ہے اور نہ کوئی آئندہ پروگرام۔

بس یہ خواہش ہے کہ جو بھی لکھوں کسی مقصد کے لئے لکھوں۔

آپ کا بلاگ اب تک کس کی بدولت فعال یا زندہ ہے؟ آپ خود یا کوئی دوسرا نام؟

بلاگ پڑھنے والے مہربانوں کی وجہ سے وگرنہ مجھ میں اتنی مستقل مزاجی نہیں۔

GOSHA-E-BLOGGERS
گوشہ بلاگرز
اردو لائبریری
URDU LIBRARY

POWERED BY WORDPRESS | THEME BY MG12 | VALID XHTML 1.1 AND CSS 3
Log in

آؤ سنواریں پاکستان

ہمارا پیارا پاکستان

Home تعارف RSS feed

اردو زبان سے دلچسپی کا سبب استاد، گھر کا فرد یا کوئی دوسرا نام؟ یا کوئی الگ وجہ؟

پہلی زبان ہے جو بولنا اور لکھنا پڑھنا شروع کی سو مافی الضمیر بیان کرنا آسان ہے۔

ویسے بھی جب مخاطب پاکستانی ہیں تو زبان بھی پاکستان کی ہی بولنا چاہیئے۔

کیا آپ اردو بلاگ دنیا روزانہ وزٹ کرتے ہیں اور مختلف بلاگز کسی ترتیب سے وزٹ کرتے ہیں یا جو بھی بلاگ سامنے آ جائے؟ اپنا بلاگنگ روٹ شیئر کریں۔

جن احباب کے بلاگز کی آر ایس ایس دستیاب ہے انہیں تو ریڈر میں ڈال رکھا ہے۔

باقی اردو سیارہ قریباً روز ہی چکر لگا لیتا ہوں۔

آپ کے بلاگ پر پہلے پانچ یا دس تبصرہ نگار کون سے تھے؟

وارث بھائی، فہد بھائی، شگفتہ بہنا پہلے تبصرہ نگار تھے۔

پھر ڈفر، جعفر، اسماء بہنا، عنیقہ بہنا، افضل بھائی، عمر، عبداللہ بھائی، بی ٹی بھائی، اجمل انکل، راشد بھائی، یاسر بھائی، کامران بھائی، حجاب بہنا، ماوراء بہنا سب نے ہمت افزائی کی۔

بلاگ دنیا میں آپ اپنا کردار کس انداز میں ادا کرنا چاہتے ہیں یا کر رہے ہیں؟

چاہتا ہوں کہ جو لکھوں کسی مقصد کے تحت لکھوں۔

اگر میرے ٹوٹے پھوٹے الفاظ اور ناکارہ جذبے

اس طرح تعمیر و تشکیل وطن کے کام آ سکیں تو سمجھوں گا تپیا سپھل ہوئی۔

بچپن کے دن

ہمارے بچپن کے بارے میں جب بھی بات ہو تو ہمارا جواب ہمیشہ یہی ہوتا ہے "اللہ کا شکر ہے کہ بیت گیا اور اب دوبارہ کبھی نہیں آئے گا"۔ آج آپ نے بچپن کی یادوں کو کھنگالنے کی فرمائش کی تو چند ایک نسبتاً بے ضرر سے واقعات جو یاد آتے ہیں آپ کی بصارتوں کی نذر کیے دیتے ہیں۔

GOSHA-E-BLOGGERS
URDU LIBRARY
اردو لائبریری
گوشہ بلاگرز

POWERED BY WORDPRESS | THEME BY MG12 | VALID XHTML 1.1 AND CSS 3 Log in

1۔ سب سے پہلے تو آپ کو بتائیں اپنے پر کئے جانے والے ایک ظلم کی داستان۔ ہمارے پھوپھا کے پاس ان دنوں کار ہوا کرتی تھی اور سن ہمارا چار برس کا تھا۔ ایک روز وہ ہمارے یہاں آئے۔ جب وہ چلے گئے تو مجھ معصوم نے اپنے والدین سے پوچھا "انکل نے کار کیسے لی؟" اللہ ہمارے والدین پر اپنی رحمتیں نازل کرے' دونوں نے جھوٹ بولنے کا نیا ریکارڈ رقم کرتے ہوئے کہا "انہوں نے پڑھا اور انہیں کار مل گئی" (انکل موصوف ٹھیکیدار تھے اور ان کی کار کا پڑھائی سے کوئی تعلق نہیں تھا)۔ معصوم بچے نے جوش میں کہا "تو پھر میں بھی پڑھوں گا"۔ خلد آشیانی والد صاحب نے اس پر ہماری والدہ کو کہا "اسے صبح سکول داخل کروادیں"۔ اور بس 1980 میں جو کار حاصل کرنے کی تگ و دو شروع ہوئی تو پھر وہ کار مئی 2005 میں ملی۔ ہم اس واقعہ کو بچوں کے استحصال کی مثال کے طور پر یاد کرتے ہیں۔

2۔ ہمارا اولین سکول جہاں ہم نے درجہ چہارم تک اکتساب علم کیا گھر سے کوئی دو تین سو میٹر کی دوری پر تھا۔ راستے میں ایک سڑک اور ایک بسوں کا اڈا پڑتا تھا جنہیں پار کرنے کے بعد ہم اپنے محلّہ میں پہنچ جاتے تھے۔ ہم اور ہمارے ہمسائیوں کی بیٹی ہم جماعت تھے اور عموماً اکٹھے سکول سے . آیا کرتے تھے۔ ان میں بد قسمتی سے اس وقت لڑکیوں والی تمام عادات موجود تھیں اور ہم بھی ان دنوں کافی مہم جو ہوا کرتے تھے۔ ایک دفعہ غالباً دوسری جماعت کا واقعہ ہے ہم سکول سے . آرہے تھے۔
سڑک پار کرنے لگے تو ایک گاڑی قریب آرہی تھی۔ ہم نے رعب ڈالنے کے لئے اپنی ہم جولی کو جن کا نام ارم تھا کہا "دیکھنا ابھی اس گاڑی سے پہلے سڑک پار کر جاتا ہوں"۔ اور پھر دوڑ لگادی۔ گاڑی والے پر جو بیتی سو بیتی لیکن ان انکل کی خونخوار آنکھیں آج بھی یاد ہیں جن سے انہوں نے بمشکل تمام ہمیں "ناگہانی وفات" سے بچانے کے بعد ہمیں دیکھا تھا۔ نتیجہ۔۔۔ اس کے بعد ہمیشہ سڑک دھیان سے ادھر اُدھر دیکھ کر پار کی۔ تھینک یو انکل۔

3۔ غالباً تیسری جماعت کا واقعہ ہے۔ ابا کا سکوٹر گھر کھڑا تھا اور اس کے ساتھ ہی بلب کا سوئچ تھا جو ہمارے کھیل کے دوران گیند لگنے سے تھوڑا اندر کو پچک گیا تھا۔ اماں ہمسائیوں کے یہاں گئی ہوئی تھیں۔ ٹھکائی سے بچنے کے لئے سوچا کہ چلو اسے اڑلیس لگا کر باہر نکال دیتے ہیں۔ اوزار اور کوئی ہاتھ نہیں آیا تو ابا جان کی مونچھیں تراشنے والی قینچی پکڑ لی۔ سکوٹر پر چڑھے اور قینچی بٹن کے اندر گھسا کر بٹن کو باہر نکالنے لگے۔ بس اتنا یاد ہے کہ زور سے ایک جھٹکا لگا تھا اور ہم سکوٹر سے نیچے آن پڑے۔ شائد سکوٹر کے ربڑ کے ٹائروں کی وجہ سے اس روز ہم مرحوم ہونے سے بچ گئے تھے کہ ہم ہی پہلوٹھی کی اولاد ہیں اور گھر میں اور کوئی بڑا موجود نہیں تھا۔

4۔ یہ بھی تیسری جماعت کا ہی واقعہ ہے۔ ان دنوں ہمیں اپنی رفتار کا بڑا زعم تھا۔ سکول سے . ی پر ہم نے ایک "مرونڈوں" کی ریڑھی دیکھی جو ایک باباجی کی تھی۔ ہم نے اپنی تیز رفتاری ثابت کرنے کے لئے ارم کو کہا"

POWERED BY WORDPRESS | THEME BY MG12 | VALID XHTML 1.1 AND CSS 3 Log in

آؤ سنواریں پاکستان
ہمارا پیارا پاکستان

Home تعارف Copyright © 2009-2011 آؤ سنواریں پاکستان RSS feed

ابھی دیکھنا میں ان باباجی کا مرونڈا اٹھا کر بھاگ جاؤں گا اور یہ مجھے نہیں پکڑ سکیں گے"۔ارم نے ایک میسنی کی خاموشی اختیار کئے رکھی۔ ہم باباجی کی ریڑھی کے پاس پہنچے ' جھپٹ کر ایک مرونڈا اٹھایا اور اڑن چھو ہو لئے۔ باباجی تو ہمیں نہ پکڑ سکے لیکن ارم نے پورے التزام کے ساتھ یہ قصہ ہماری والدہ کو آ سُنایا۔اور پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

5۔ تیسری یا چوتھی جماعت کا واقعہ ہے۔ ہمیں گنتی اور کرنسی سے تو واقفیت اچھی خاصی تھی لیکن چار آنے 'آٹھ آنے وغیرہ سے نابلد تھے۔ ہمارے ذمہ ایک جوتے کو مرمت کروانا ٹھہرا۔ موچی کے پاس گئے 'اس نے جوتا مرمت کیا۔ ہم نے پوچھا کے روپے؟ انہوں نے کہا آٹھ آنے۔اب ہمارے پاس ایک روپیہ تھا سو گھبرا گئے کہ یا اللہ میرے پاس صرف ایک روپیہ ہے اور یہ "آٹھ" آنے مانگ رہا ہے۔ لجاجت سے عرض کی "ایک روپیہ لے لو گے اس کا؟" موچی صاحب نے تاڑ لیا کہ "چوچا" ناواقف ہے۔ بے نیازی سے کہنے لگے "جیسے تمہاری مرضی"۔ ہم نے ایک روپیہ انہیں پکڑایا اور احساس شکر گزاری سے لبریز گھر پہنچے۔ گھر والوں نے پوچھا "جوتا مرمت کروا آئے"۔ جواب دیا "جی ہاں"۔ پوچھا "کتنے دام میں؟" ہم نے فخر یہ سارا واقعہ بتا دیا۔ بس پھر اس دن کے بعد سے آٹھ آنے کا حساب بھی ازبر ہو گیا۔

یادِ رفتہ

جہاز اڑنے کے لئے تیار تھا۔ نورالعین اور اس کی اماں فرسٹ کلاس کی کشادہ سیٹوں پر ٹیک لگائے اپنے اپنے مشروب کی چسکیاں لے رہی تھیں اور خدیجہ ان سے اگلی رو میں اپنی سیٹ یعنی اپنے ابا کی گود میں اچھل رہی تھی کہ اسے جوس پینا تھا۔ ایئر ہوسٹس سے سٹرا لے کر خدیجہ کو جوس پلاتے ہوئے میرے خیالوں میں تیرہ چودہ برس کا وہ لڑکا آ گیا جو اپنے والدین کی پہلی نرینہ اولاد تھا۔اس کے والد اپنے والدین کی اکلوتی نرینہ اولاد تھے اور جب ایک بیٹی کے بعد وہ پیدا ہوا تو خاندان بھر میں خوشیاں منائی گئیں۔ اگرچہ والدین نے نام محمد شفیع رکھا لیکن اس کی پھوپھیاں اسے لاڈ سے "برکت" کے نام سے پکارتی تھیں کہ اس کے بعد اللہ نے اس گھر کو تین مزید بیٹوں سے نوازا تھا جن میں سے سب سے چھوٹے کی عمر اس وقت چھ ماہ تھی۔ جس روز کا ذکر ہے اس روز تقدیر نے "برکت" کو یتیم کر دیا تھا۔اس کے لاڈ اٹھانے والا باپ اسے دنیا کے تھپیڑوں کے حوالے کر کے خود مٹی کی چادر اوڑھ سویا تھا۔ چھوٹی سی زمینداری اور کثیر العیالی کا بارِ گراں۔ اس کے ننھے کاندھے یہ بوجھ کیسے اٹھا پائیں گے؟

POWERED BY WORDPRESS | THEME BY MG12 | VALID XHTML 1.1 AND CSS 3
Log in

آؤ سنواریں پاکستان

ہمارا پیارا پاکستان

یہ مصیبت کیا کم تھی کہ "شریکوں" نے موقع غنیمت جان کر کھڑی کھیتی میں بکریاں چرا ڈالیں۔ اپنی یتیمی کا ماتم کرنے سے کسے فرصت تھی کہ اس موقع پر لڑائی کرتا اور اس کے لئے لڑتا بھی کون؟ نہ کوئی چچا نہ کوئی تایا۔ یہ امتحان کم نہ جان کر قدرت نے ایک اور آزمائش کی۔ یکے بعد دیگرے ان کے جانور مرنے لگے۔ پنجاب کے دیہات میں تو جانور ہی "مال" سمجھے جاتے ہیں۔ نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ تمام گھر کا کل اثاثہ ایک بھینس رہ گئی۔ خدا کا کرنا کہ وہ بھینس بھی بیمار پڑ گئی۔ شام ڈھل رہی تھی جب اس کی والدہ نے کہا" بیٹا اس بھینس کے دن اب پورے ہوگئے ہیں۔ یہ اگر اندر مر گئی تو ہم دونوں سے اٹھائی نہ جائے گی۔ آؤ اسے ہنکا کر باہر لے چلیں تا کہ بعد میں مشکل نہ ہو۔" دونوں ماں بیٹا مل کر بھینس کو ہنکا کر گھر سے باہر لے گئے اور اس رات وہ بھینس بھی مر گئی۔

صبح اس مری ہوئی بھینس کا چمڑا، چماروں کو بیچا اور اس کے دس پیسے ملے (یہ قصہ بیسویں صدی کے انتہائی اوائل کا ہے) جو اس گھر کی کُل پونجی تھی۔ گاؤں والوں نے یہ حال دیکھا تو سوچا کہ مل بانٹ کر اس گھر والوں کی کچھ مدد کی جائے سو ایک پنچائت بلائی گئی۔ نائی محمد شفیع کو بلانے آیا۔ بلاوا سُن کر اس کی والدہ کا ماتھا ٹھنکا اور بیٹے کو کہا کہ بیٹا تم چلو، میں چھت پر سے آتی ہوں۔ محمد شفیع چوپال میں پہنچا تو اس کے رشتہ کے چچا نے جو غیر روائتی طور پر برادری کے سربراہ تھے انہیں کہا "بیٹا ہمیں معلوم ہے تم لوگوں پر آجکل مشکل وقت ہے۔ سو ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ سب مل کر تمہیں راشن ڈال دیتے ہیں تا کہ تمہارے گھر کا خرچ چل سکے۔" ابھی ان کی بات مکمل ہی ہوئی تھی کہ چھت کے اوٹ سے محمد شفیع کی والدہ گرج اٹھیں۔ "میں مانتی ہوں کہ ہم پر اللہ کی آزمائش ہے لیکن ایسی کوئی بات نہیں کہ ہمیں کسی کی خیرات کی ضرورت پڑے۔ اللہ کا ہم پر کرم ہے۔ یہ چند پیسے ہمارے پاس ہیں، آپ ایسا کیجئے یہ رکھ لیجئے اور کسی ضرورت مند کو دے دیجئے۔ بیٹا انہیں پیسے دے دو اور آؤ گھر چلیں"۔ محمد شفیع ماں کے حکم کی تعمیل میں اپنی ماں کے پیچھے پیچھے گھر آ گیا۔ اس محمد شفیع کی، جس کی کل پونجی اس وقت وہ دس پیسے تھے، پڑپوتیاں جہاز کی فرسٹ کلاس میں سفر کر رہی تھیں۔

فبائی آلاء ربکما تکذبن۔

یہ محمد شفیع میرے دادا تھے جنہوں نے والد کی وفات کے بعد ہل کی ہتھی کو ہاتھ میں پکڑا اور زمین کا سینہ چیرتے ہوئے اپنے رب کا فضل تلاش کرنے لگ پڑے۔ اللہ جب آزمائش کرتا ہے تو انعام بھی کرتا ہے۔ اس مشکل وقت میں ان کے اکلوتے اور متمول ماموں نے اپنی لاڈلی بہن کے ایک بیٹے اور بیٹی کا بار اُٹھایا لیکن خوددار بہن نے بھائی کی بھی حد سے زیادہ مدد کو گوارا نہ کیا اور آٹھ نفوس پر مشتمل باقی کنبہ کی کفالت کا بار دادا ابو نے ہی اُٹھایا۔ آہستہ آہستہ حالات سنبھلنے لگے اور زندگی کا پہیہ چل پڑا۔ دادا ابو ہل چلاتے رہے، پھوپھیاں اپنے بھتیجے پر نثار ہوتی رہیں اور وقت گزرتا گیا۔ ماں کو اپنے بیٹے پر ہر طرح کا مان تھا اور دادا ابو؟ انہیں اللہ کے بعد اپنی ماں کی دعاؤں اور اپنے زور بازو پر یقین تھا۔ ماں نے لوگوں کی امداد سے انکار کر کے خودداری کا جو سبق پڑھایا تھا،

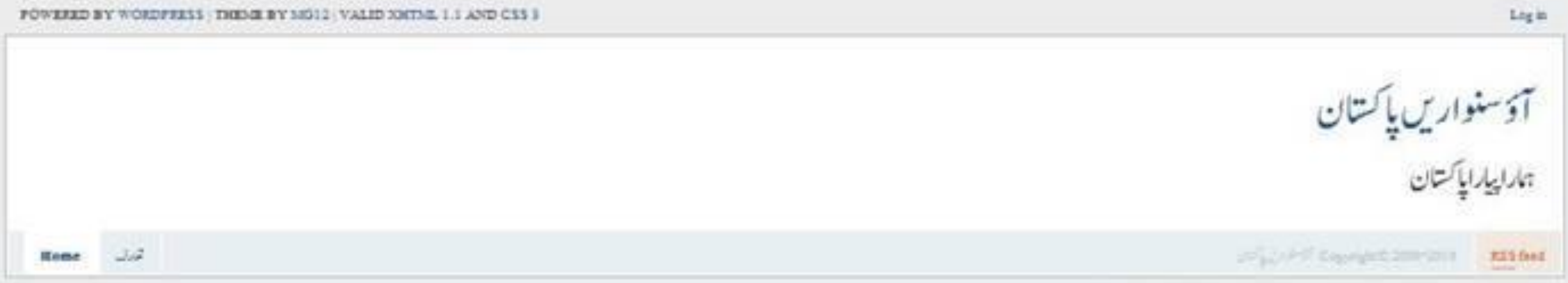

اسے تمام عمر ایسے ذہن نشین رکھا کہ کبھی کسی معاملے میں بھی کسی کی مدد نہ طلب کی۔ خودداری اور انا پسندی میں ایک باریک سا فرق ہے اور حیرت انگیز طور پر دادا ابو اپنی تمام عمر اس فرق کو پار کئے بغیر گزار گئے۔ اس میں سب سے زیادہ عمل شائد ان کی والدہ کا تھا۔ چھ فٹ کے گھبرو جوان لاڈلے بیٹے سے جب بگڑتی تھیں تو اس کا کھانا پینا بند کر دیتی تھیں۔ اور دادا ابو جن کی پکڑ کبھی کوئی شہہ زور نہ چھڑا سکا' ان کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ پر مار سکیں۔ ایک دفعہ کا قصہ خود مجھے سُنایا "بے بے مجھ سے ناراض ہو گئی تو میرا کھانا پینا بند کر دیا۔ ہل چلا کر آیا تو زور کی بھوک لگ رہی تھی لیکن حکم تھا کہ کھانا نہیں ملے گا مجھے۔ سو بیل حویلی باندھ کر گھر کی جانب چلا لیکن اندر جانے کی بجائے دروازے کے ساتھ چھُپ کر کھڑا رہا۔ تمہاری دادی روٹیاں پکا رہی تھی اور بے بے اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد بے بے اٹھ کر رسوئی میں گئی اور میں نے موقع غنیمت جانا۔ لپک کر اندر گیا' چنگیر میں سے دو روٹیاں اٹھائیں دو چمچ سالن اوپر ڈالا اور بے بے رسوئی میں سے باہر نکل رہی تھی جب میں باہر کو بھاگا۔ روٹیاں کھانے کو گھر سے دور پیڑ کے نیچے ابھی بیٹھا ہی تھا کہ بے بے بھی پیچھے پیچھے پہنچ گئی۔ "لا ادھر کر میری روٹیاں" بے بے نے غصے سے کہا۔ میں نے بے کسی سے کہا "بے بے روٹی نہ کھاؤں تو کیا بھوکا مر جاؤں؟" اس پر بے بے کا دل پسیجا اور مجھے معافی ملی"۔

ماں کا یہی مان تھا جس نے تمام عمر دادا ابو کی رہنمائی کی اور تمام عمر انہوں نے اپنی ماں سے زیادہ کسی سے پیار نہ کیا۔ ہماری رشتے کی ایک دادی بتایا کرتی تھیں کہ دادا ابا نے بیل تھامے جب ہل چلا کر آنا تو ان کی اماں نے ان پر غصہ سے برسنا شروع کرنا۔ دادا ابا نے مسکراتے ہوئے ماں کی طرف دیکھتے رہنا اور کھانا کھا کر بنا کچھ بولے اسی طرح مسکراتے ہوئے گھر سے چلے جانا۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ اسی وجہ سے اتنی عمر ہو گئی' ان کی اتنی زیادہ آل اولاد ہے لیکن یہ کسی کو بھی کہیں بھی کچھ بھی کہہ دیتے ہیں اور کوئی ان کے آگے نہیں بولتا۔

دادا ابو اچھی نسل کے بیلوں کے شیدا تھے۔ اپنی آخری عمر تک ان کے ہم عمر انہیں شفیع بیلوں والا کہہ کر بلاتے تھے۔ لوگ مذاق سے کہا کرتے تھے کہ کہتے ہیں بابا بوڑھا ہو گیا ہے لیکن شام کو اگر خبر ملے کہ کئی کوس پر کسی نے اچھا بیل خریدا ہے تو صبح سب سے پہلے پہنچ جاتا ہے۔ بیلوں کے بعد اگر کسی چیز کا شوق تھا تو بازو پکڑنے کا۔ اس کھیل میں انہیں کبھی کسی نے شکست نہ دی اور ایسا ہونا کچھ اچنبھے کی بات بھی نہ تھا۔ سو برس سے اوپر کی عمر میں ان کی قوت ارادی کا مظاہرہ تو میں نے بارہا خود کیا۔ اپنے چھ چھ فٹے پوتوں کے ساتھ جب وہ بازو پکڑا کرتے تھے تو ہمارے بازو کے ساتھ جھول جایا کرتے تھے۔ ہمیں یہ ڈر خواہے ہو کہ کہیں انہیں چوٹ نہ لگ جائے' وہ ایسی کسی فکر سے بھی بے نیاز ہوتے تھے۔ زندگی میں اپنی ذات پر یہ اعتماد ان کا بنیادی وصف رہا اور جہاں اس نے انہیں تمام عمر سر اُٹھا کر جینے کا عزم و حوصلہ دیا وہاں ایک خاص حد تک خطرات سے یہ بے نیازی ہی ان کے وصال کا سبب بنی۔

POWERED BY WORDPRESS | THEME BY MG12 | VALID XHTML 1.1 AND CSS 3
Log in

آؤ سنواریں پاکستان

ہمارا پیارا پاکستان

اس کے بارے میں کچھ بعد میں۔ ایک سو برس سے اوپر کی عمر میں بھی جب ان کے جسم کا صرف ایکسرے ہی باقی رہ گیا تھا' ان کی کلائی کو مکمل اپنی گرفت میں پکڑنا کم از کم میرے بس کی بات نہ تھی۔ آج تک مجھے کسی ایسے شخص کی تلاش ہے جس کی کلائی ان جتنی چوڑی ہو۔ ہمارا گھر ایک باغ کے کنارے تھا۔ ایک روز دادا ابا مجھے کہنے لگے یار یہ جو باغ میں ہل چلاتا ہے اس کا ایک بیل بہت اچھا ہے۔ جی کرتا ہے اسے دیکھنے چلیں۔ میں ہمہ وقت تیار سو دادا پوتا کی جوڑی پیدل ہی باغ والے کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں پانی کا ایک کھال تھا۔ اس پر نظر پڑی تو سوچنے لگا کہ دادا ابو کو اس کے پار کیسے لیکر جاؤں گا۔ کمر پر سوار کرلوں کہ بازوؤں میں بھر کر پھلانگ جاؤں۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا جب ہم اس کے کنارے پہنچے اور اس سے پہلے کہ میں اپنے کسی تدبیر کو فائنل کرتا' دادا ابو نے اپنی لاٹھی کھال کے کنارے ٹکائی اور کسی پول والٹ اولمپیئن کی طرح ایک ہی جست میں اس پار پہنچ گئے۔ دوسرے کنارے پر کھڑا میں ہونقوں کی طرح اس ساری کاروائی کو دیکھا کیا۔

دادا ابو نے باپ کی شفقت سے زیادہ فیض نہ اٹھایا لیکن یتیمی کے بعد اپنے بھائیوں کو باپ کی طرح ہی پالا اور ان پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ جتنی والہانہ محبت انہیں اپنے بھائیوں سے تھی' کم از کم میرے مشاہدے میں ایک کے سوا اس کی کوئی مثال نہیں۔ ان کے برادران نے البتہ برادران یوسف کی یاد تازہ رکھی۔ اپنی اولاد سے دادا ابو کا تعلق روائتی سے ہٹ کر تھا۔ اگرچہ بڑھاپے میں جب جی چاہا جسے جو چاہا کہہ لیا لیکن کبھی بھی اولاد پر اپنی مرضی مسلط نہیں کی اور نہ کبھی مار پیٹ کی۔ ایک عجیب سی بے نیازی تھی ان کے رویے میں۔ جہاں میری دادی کے ہاتھ سے اگر پیالہ بھی چھوٹ جاتا تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھتیں "اللہ میرے بچوں کی خیر" وہاں دادا ابو اپنی زندگی میں مگن تھے۔ یہ نہیں کہ انہیں کسی کی پرواہ نہیں تھی۔

ان کی طبیعت میں بس ایک خاص قسم کا سکون تھا۔ کبھی کسی ایسی کی خواہش نہ رکھنے کا سکون جو ان کی ضرورت نہیں تھی اور ایسی کوئی چیز ہی نہ تھی جس کے بغیر وہ اپنی زندگی کو نامکمل محسوس کرتے۔ ایک پرسکون سمندر کی طرح جو زمانے کے تمام گرم و سرد دیکھ چکا ہو' وہ اپنی دنیا میں مگن تھے کہ ان کی ضرورت انہیں میسر تھی۔ اور ان کی ضرورت کیا تھی؟

صبح دو چپڑی روٹیوں کے ساتھ دہی کا پیالہ اور لسی' دوپہر کو دو روٹیاں سالن اور لسی کے ساتھ اور شام کو دو روٹیاں سالن کے ساتھ اور ایک پیالہ دودھ کا سونے سے پہلے۔ یہ تمام عمر کا معمول تھا۔ کہا کرتے تھے بیٹا جب کھانا کھا لیا تو پھر کوئی سونے کی بنی چیز بھی کھانے کو دے اسے نہیں لینا چاہیئے۔ باقی کسی دنیاوی چیز کی انہیں ہوس ہی نہ تھی۔ نہ زمین کی نہ کپڑے کی نہ چوہدراہٹ کی۔ جن دنوں ریاست بہاولپور میں زمینوں کی تقسیم جاری تھی' ان کے بڑے بہنوئی نے کئی دفعہ اصرار سے کہا "بھائی تھوڑی سی زمین لے لو۔ صرف آٹھ آنے مربع کو مل رہی ہے۔" اُن کا جواب یہی رہا "میں نے کیا کرنا ہے اتنی زمین کو؟"

آخری عمر میں جب ان کا لاڈلا پوتا یعنی میں شکوہ کرتا تو کہہ دیتے "بس پتر غلطی ہو گئی"۔ ہم دادا پوتا کا تعلق بھی عجیب تھا۔ دادا ابا نے اگر اپنی اماں کے بعد کسی سے خوف یا کسی کا لحاظ رکھا تو وہ میرے ابا جان تھے (اللہ غریق رحمت کرے)۔ شائد اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ والد صاحب خلد آشیانی اپنی دادی کے چہیتے تھے اور وہ کہا کرتی تھیں کہ جس نے میرے اس پوتے کو کچھ کہا وہ میرا دشمن ہے۔

راجپوتی خون کی گرمی بھی والد صاحب کو ذرا فراخ دلی سے عطا کی گئی اوپر سے دادی کے چہیتے سو دونوں باپ بیٹے میں پیار اور رعب کا عجیب سا رشتہ تھا جس میں رعب بیٹے کا باپ پر تھا۔ پھر ہمارے والد صاحب خاندان کے پہلے خواندہ شخص بھی بنے سو ان کے رعب کو چار چاند لگ گئے۔ والد صاحب کی شخصیت اپنے خاندان میں اس قدر بھاری بھر کم تھی کہ ان کی موجودی میں اور کسی کی طرف دھیان ہی نہ جاسکتا تھا۔ دادا ابا سے لیکر ایک نوزائیدہ بچے تک کو یہ علم تھا کہ ان کے آگے پر نہیں مارنا۔ سو اگرچہ میں پہلوٹھی کی اولاد تھا لیکن ایک تناور شجر کے تلے اگنے والے ننھے منے بوٹے کی طرح ہم پر دھیان ذرا کم کم ہی جاتا تھا۔ زندگی کے اٹھارہ برس تک میرا اور دادا ابو کا تعلق بس ایسے رہا کہ ہم دونوں کو معلوم تھا کہ دوسرا بھی موجود ہے۔ پھر ایف ایس سی کے بعد یونیورسٹی کے داخلے کھلنے میں دیر تھی اور دادا ابو ان دنوں ہمارے یہاں قیام کے لئے آگئے۔ وہ چند ماہ جب ہم دونوں دادا پوتا اکٹھے رہے تو یکدم ایکدوسرے کے لئے بہت اہم ہو گئے۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ میں نے ان سے گونگے پہلوان کے متعلق پوچھا تھا۔ بس اس بات سے دادا ابو نے یادرفتہ کے اوراق جو کھولنا شروع کئے تو اگلے چند ماہ گزرنے تک ہم دونوں گہرے دوست بن چکے تھے۔ میں فارغ تھا اور دادا ابو کے پاس ایک سو برس کی زندگی اور اس کے تجربات تھے۔ میں سُنتا رہا اور وہ سُناتے رہے۔ پھر بعد کے دس برس میں نے خاندان میں سب سے چہیتے پوتے کے طور پر گزارے۔ اتنا پیار بڑھا دادا ابو کو مجھ سے کہ انہوں نے میری خاطر خاندان کے ہٹلر یعنی ہمارے والد گرامی تک سے ٹکر لے لی۔ یہ بھی ایک خاصا دلچسپ قصہ ہے۔

انجنیئرنگ یونیورسٹی سے چھٹیوں پر میں گھر آیا ہوا تھا۔ سردیوں کے دن تھے اور دادا ابو ہمارے یہاں آئے ہوئے تھے۔ میں کسی کام سے ایک ویلڈنگ والے کے پاس گیا۔ اس نے نہایت رکھائی سے کسی بات کا جواب دیا۔ مجھے غصہ آیا لیکن کیونکہ ویلڈنگ والا والد صاحب کا واقف تھا سو غصہ میں کھولتا ۔ آگیا۔ گھر آکر والد صاحب کو بتایا کہ آپ کے اس واقف کار نے مجھ سے نامناسب بات کی ہے اور آپ کے لحاظ میں میں ۔ آگیا ہوں۔ والد صاحب اسی وقت اٹھے اور مجھے ساتھ لیکر اس ویلڈنگ والے کے پاس چلے گئے۔ وہ صاحب والد صاحب کے سامنے سارے وقوعہ سے ہی مکر گئے۔ اب اس کے اس طرح صاف مکرنے پر مجھے اتنا غصہ آیا کہ میں کانپنے لگ پڑا۔ والد صاحب نے سرزنش کی "اپنے آپ کو سنبھالو" اور ساتھ ہی گال پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔

لو جی ہم بجائے ویلڈنگ والے کو کچھ کہنے کے بھرے بازار میں تھپڑ کھا کر مزید غصے میں کھولتے . آ گئے۔ آکر دادا ابو کو سارا قصہ سُنایا۔ دادا ابو خاموش رہے۔ والد صاحب رات کو عموماً دیر سے گھر آیا کرتے تھے اور دادا ابو عشاء کے فوراً بعد سو جایا کرتے تھے۔ سو جب تک والد صاحب آئے دادا ابو سو چکے تھے۔ صُبح ہوئی تو نماز پڑھنے کے بعد مجھے پوچھنے لگے "تمہارا باپ کیا کر رہا ہے؟" میں گیا اور آکر بتایا کہ صحن میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ کہنے لگے "آؤ چلیں"۔.

میں آنے والے واقعات سے بے خبر ان کے ساتھ چل دیا۔ دادا ابو لاٹھی ٹیکتے صحن میں پہنچے اور پہنچتے ہی غصہ سے بولے "کیوں میاں کس خوشی میں کل تم نے اسے تھپڑ مارا تھا؟" والد صاحب سمیت سارے گھر کو سانپ سونگھ گیا۔ کئی دہائیوں میں پہلی بار دادا ابو نے والد صاحب کو اس انداز میں مخاطب کیا تھا۔ لیکن یہ تو صرف آغاز تھا۔ والد صاحب سر نیچا کئے اخبار پڑھتے رہے اور پھر جو دادا ابو گرجنا شروع ہوئے تو بس۔ سب حیران اور میں دل ہی دل میں دادا ابو کو ہلا شیری دے رہا تھا کہ تھوڑا سا اور تھوڑا سا اور۔ پانچ دس منٹ خوب گرجنے کے بعد دادا ابو نے للکارا "آئندہ اس کو ہاتھ لگاؤ گے؟" والد صاحب نے سر نیچا کئے ہی نفی میں سر ہلا دیا۔ اس پر دادا ابو نے مجھے کہا آؤ چلیں اور دادا ابو لاٹھی ٹیکتے آگے آگے اور میں اپنے دل میں خوشی سے چھلانگیں لگاتا قلقاریاں مارتا ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ بس اس دن کے بعد میری حیثیت خاندان میں سب سے چہیتے فرد کی ہو گئی۔ والد صاحب خلد آشیانی نے بھی اپنے وعدہ کی ایسی لاج رکھی کہ اس کے بعد اگر میں نے ان کی کسی بات کی پرزور اور کبھی گستاخانہ مخالفت بھی کی تو بھی انہوں نے مجھے کبھی کچھ نہ کہا۔ دادا ابو بھی اس کے بعد جب ملتے تو یہ سوال ضرور کرتے' "پھر تو اس نے تمہیں نہیں مارا؟" اور میرے نفی میں جواب سے ہی ان کی تسلی ہوتی۔ کئی بار جب وہ والد صاحب سے ناراض ہوتے تو مجھ اپنی سوچوں میں شریک کرتے اور اس دوران جب کبھی والد صاحب کو صلوٰاتیں سُناتے ہوئے خیال آتا تو مجھے کہتے "تجھے بُرا تو نہیں لگ رہا میں تیرے باپ کو بُرا بھلا کہہ رہا ہوں؟" میں جواباً کہتا "مجھے کیوں بُرا لگے گا؟ آپ کے بیٹے وہ پہلے ہیں۔ جی بھر کر کوسنے دیں میری طرف سے" اور دادا ابو خوش ہو کر پھر سے شروع ہو جاتے۔ بد قسمتی یہ رہی کہ جب میں نے امریکہ آنا تھا تو دادا ابا چچاؤں سے ناراض ہو کر اپنے بھانجے کے یہاں مقیم تھے۔ مجھے اس بات کا علم گاؤں پہنچنے پر ہوا۔ میرا معمول ایسا بنا تھا کہ میں ایک رات کو شدید دھُند میں گاؤں پہنچا' دوپہر کو میں نے . لاہور آنا تھا اور اگلے روز رات کو میری امریکہ کی فلائٹ تھی۔ سوا س رات کو جب میں پہنچا تو دادا ابو کے سونے کا وقت ہوئے بھی مدت ہو چکی تھی۔ صبح ناشتے کے بعد میری روانگی تھی۔ اتنا وقت ہی نہ تھا کہ انہیں منا کر گھر لا سکوں۔ انہیں ملنے گیا تو وہ بس ساری دُنیا سے ناراض بیٹھے رہے۔ چچا نے کہا کہ آپ نے پہچانا ہے نا کہ کون آیا ہے؟ انہوں نے بے رُخی سے کہا ہاں پتہ ہے بشیر کا بیٹا ہے۔ ان کا خیال شائد یہ تھا کہ میں چچا کی طرفداری کرنے آیا ہوں۔ میں نے بتایا کہ میں اگلے روز امریکہ جا رہا ہوں۔

POWERED BY WORDPRESS | THEME BY MG12 | VALID XHTML 1.1 AND CSS 3
Log in

آؤ سنواریں پاکستان

ہمارا پیارا پاکستان

انہوں نے دُعا دی اور میں بوجھل دل سے . لاہور آگیا۔ میرے آنے کے بعد دادا ابو اتنے بے قرار ہوئے کہ بغیر کسی کے منائے گھر آگئے۔ پھر میرے چچازاد نے بتایا کہ سارا دن تمہارے لئے دعائیں کرتے رہے ہیں۔ میں امریکہ آگیا۔ دادا ابو اسی طرح زندگی کے شام و سحر گزارتے رہے۔ پھر ایک روز اسی طرح لڑ کر اپنے دوسرے بھانجے کے یہاں چلے گئے۔ وہاں نماز کے لئے کھڑے ہونے لگے تو گر پڑے۔ قریباً ایک سو دس برس کی عمر میں پکے فرش پر گرے تو ٹانگ میں چوٹ آگئی۔ ٹانگ کی چوٹ تو شائد معمولی تھی لیکن دادا ابو کو زندگی بھر کبھی کسی کی محتاجی کی عادت ہی نہ تھی۔ اب جو خود سے ہلنے سے معذور ہوئے تو اس حالت سے سمجھوتہ نہ کر سکے۔ وہ عزم جو جوانوں سے بازو پکڑتے وقت انہیں ہارنے نہیں دیتا تھا' ٹانگ کی ایک غیر متوقع چوٹ سے آنے والی وقتی محتاجی پر ان کا ساتھ چھوڑ گیا۔ اور بس پھر آہستہ آہستہ وہ گھلتے چلے گئے اور اکتوبر کی ایک شام مٹی تلے جا سوئے۔ ان کی وفات کے سوا دو ماہ بعد جب میں پاکستان گیا تو والد صاحب شدید علیل تھے۔ ایک روز سب سے علیحدگی میں مجھے وصایا کیں اور کہنے لگے "بیٹا زندگی میں کبھی کسی مشکل میں گھبرانا نہیں۔ تیرے دادا نے تیرے لئے بہت دعائیں کی ہیں۔" آج اس داد کی پوتیاں جہاز کی فرسٹ کلاس میں بیٹھی سفر کر رہی تھیں۔.

نظام تعلیم

دیری تو اس موضوع پر لکھنے میں بھی ہوئی لیکن مصروفیات کچھ ایسی تھیں کہ لکھ نہ سکے اور پھر خیالات بھی کچھ ایسے پریشان تھے کہ انہیں مجتمع کرنے کے لئے جس یکسوئی کی ضرورت تھی وہ میسر نہ تھی۔ خیر آج جب کچھ فرصت میسر ہے تو کوشش کرتا ہوں کہ اس سادہ ورق پر اپنے کچھ مشاہدات کے ذریعے پاکستان کے نظام تعلیم کے متعلق کچھ بیان کیا جائے۔ کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی ذمہ داری میں اپنے قارئین کی دید اور صوابدید پر چھوڑتا ہوں۔ ایک حادثہ کے نتیجہ میں جب ہماری تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہوا تو ہمارا پہلا مکتب ایک پرائیویٹ سکول ٹھہرا جس کا نام مدرستہ البنات تھا۔ اگرچہ نام سے تو یہ خالصتاً نسوانی ادارہ ہونا چاہیئے تھا لیکن اس دور میں (1979) یہاں مخلوط تعلیم تھی اور پنجم جماعت تک تعلیم دی جاتی تھی۔ زمرہ اساتذہ میں البتہ تمام تر خواتین ہی تھیں اور ماسوا ایک پی ٹی ماسٹر کے بقیہ معاملات کلیتاً خواتین کے سپرد تھے۔ اس سکول کا ماحول حسب توقع انتہائی مہذب تھا۔ اگرچہ چند استانیاں درشت مزاج تھیں لیکن بحیثیت مجموعی ایک انتہائی معتدل اور علم پرور ماحول تھا۔

تربیت پر توجہ اس لئے دی جاتی تھی کہ خواتین کی موجودی میں دشنام طرازی اور دیگر مکروہات کا گزر ممنوع تھا سو درجہ چہارم تک ہم نے جو کچھ کتابوں میں پڑھا' کافی حد تک اس پر عمل ہوتے بھی دیکھا اور ہمارے مزاج کا کھلنڈرا پن اس دور میں اپنے عروج پر رہا۔ پھر ہمارے والدین نے طویل غور و خوض کے بعد ہمیں گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول صادق آباد میں داخل کروادیا۔ وجہ اس کی یہ کہ اس دور میں اس سکول کا نتیجہ تمام ڈویژن میں بہترین آیا کرتا تھا اور بورڈ کے امتحانات میں پہلی تین میں سے کوئی ایک کا حامل ہونا اس مکتب کے لئے معمول کی بات تھی۔ ان سب باتوں سے قطع نظر اس سکول کا ماحول انتہائی درجہ تک عوامی تھا۔

سو جب ہم کرسی ڈیسک کے ماحول سے یکدم ٹاٹ پر اُتارے گئے تو ایک دھچکا لگا۔ ون ٹو کرتے جب ایک دو کے پہاڑے سُنانے کا تقاضا ہوا تو ہم صرف ہونقوں کی طرح مُنہ دیکھا کئے۔ والدین نے چار برس کی عمر میں سکول بھیجا تھا تو اس نئے سکول میں ہم اپنی جماعت کے سب سے کم عمر فرد ٹھہرے۔ نہ ہمیں ساتھیوں کی بات سمجھ آتی نہ استادوں کہ ذریعہ تعلیم پنجابی تھا اور ہم اس وقت تک صرف اُردو بول سکتے تھے یا انگریزی اور کچھ کچھ عربی۔ جہاں گزشتہ سکول میں زیادہ سے زیادہ سزا ایک چپت یا مسطر سے چند معصوم سے ضربیں ہوا کرتی تھیں'

نئے سکول میں مولا بخش ایک لازم ہتھیار تھا اور اساتذہ اس کا استعمال کافی فراخدلی سے کیا کرتے تھے۔ قصہ مختصر یہ کہ جب ہم ایک خالصتاً نسوانہ ماحول سے یکدم ایک خالص مردانہ ماحول میں پہنچے تو یوں لگا کہ ایک بپھرے ہوئے سمندر میں پھینک دئے گئے ہیں۔ قصور اس میں سکول کا نہ تھا بلکہ ان دو متوازی نظاموں کا تھا جن کا ہم شکار بنے۔ جہاں پہلے مکتب میں لوگ سچ بولتے' نستعلیق طریقے سے زندگی گزارتے تھے' نئے سکول میں دشنام طرازی' ذومعنی فقرہ بازی' جنگ و جدل' لڑائی مار کُٹائی عام تھی۔ اس خالصتاً عوامی ماحول میں ہمیں جائے امان یہی نظر آئی کہ اپنے خول میں دُبک جائیں۔ آہستہ آہستہ ہم جماعتوں پر اس کا انکشاف ہوا تو ہمیں کچھ ستانا شروع کیا۔ ایک ایسی ہی واردات کے بعد ہمارا ٹھنڈا ٹھار راجپوتی خون گرمی کھا کر اُبلا تو اپنے سے دوگنے ڈیل ڈول والے ہم جماعت سے بھڑ پڑے۔ نتیجتاً خوب پھینٹی پڑی۔ ابھی ہماری درگت بن رہی تھی کہ ایک اور ہم جماعت کو جوش آیا اور وہ ہماری حمایت میں میدان میں آموجود ہوا۔ ہم دونوں اس معرکہ میں فاتح نہیں تو برابر تو چھوٹے لیکن اس روز جس دوستی کی بنیاد پڑی وہ آج چھبیس برس کے بعد بھی الحمدللہ قائم ہے۔ میرے اس دوست کا نام ہے محمد نائب جو اس جہان فانی میں میرا پہلا یار بنا۔ بہتیرے گرم و سرد دیکھے ہم . نے اکٹھے لیکن الحمدللہ آج بھی یہ دوستی قائم ہے . اگرچہ اس دوستی کے قیام اور بقا کا سارا سہرا نائب کے اس بے لوث جذبہ اور وفا کو جاتا ہے جس کا پہلا اظہار اس نے آج سے چھبیس برس قبل کیا تھا۔ نائب کی صورت میں ایک دوست ملا تو ہم نے بھی نئے سکول میں کچھ دلچسپی لینا شروع کی۔ یہ ساتھ پنجم تک رہا۔

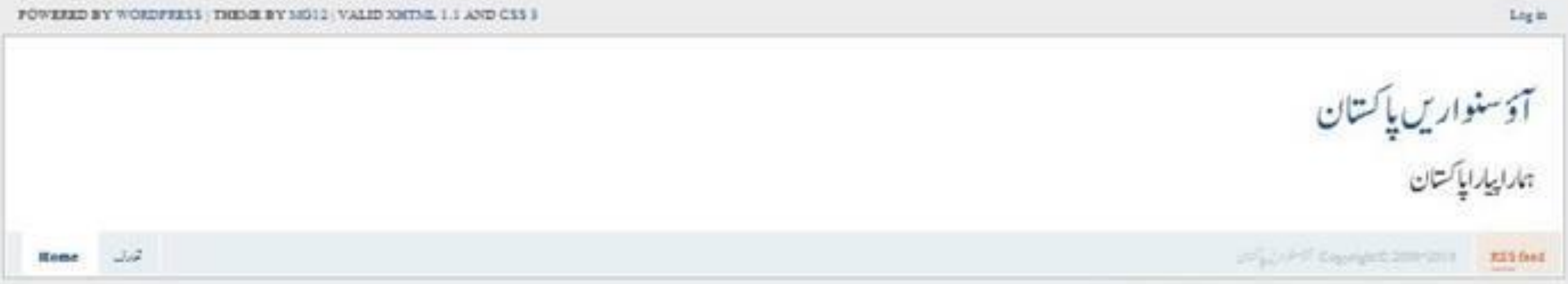

پنجم کے بعد دوسرے سکولوں سے طلباء ہمارے سکول میں داخل کئے گئے تو ایک جماعت کو کئی سیکشنوں میں بانٹ دیا گیا۔ ظلم یہ ہوا کہ نائب کو ہم سے الگ سیکشن میں بھیج دیا گیا۔ نئے لڑکے تو گویا ایک نئی ہی مخلوق تھے۔ اتنا تنوع آیا ہمارے ماحول میں کہ بس الاماں۔ ہر روز نئے انکشافات۔ جسے دوست سمجھیں وہی اُلو بنا کر چلتا بنے۔ ہم سمجھتے تھے کہ جسے اچھی اقدار کا سبق اچھی طرح یاد ہے وہ ان اقدار پر عمل بھی سب سے زیادہ کرے گا۔ اس وقت تک یہ ادراک ہی نہ تھا کہ سبق یاد کرنا اور بات ہے اور اس پر عمل اور۔ سو خوب جی بھر کے ٹھوکریں کھائیں۔ بدقسمتی یہ رہی کہ ایک مثالی دُنیا کی تلاش ہم نے چھوڑ نہ دی بلکہ عمر عزیز کے اگلے پانچ برس کا عرصہ ہم نے اسی تلاش میں گُزار دیا۔ اللہ کا شُکر ہے کہ پڑھائی میں اچھے تھے تو گزارا چلتا رہا لیکن کتابوں سے جی اُچاٹ تھا۔ اساتذہ اور والدین کتابوں پر زور دیتے تھے اور ہم مشاہدہ کے شیدا تھے۔ سو اول الذکر افسوس کرتے رہے اور ہم اپنی دُنیا میں گم حیراں و سر گرداں بھٹکتے، ٹھوکریں کھاتے زندگی کے دن گُزارتے رہے۔ اس پر طُرہ یہ کہ ہمارے خالہ زاد پڑھائی میں ماشاء اللہ بہت اچھے تھے اور اپنی جماعت میں اول آیا کرتے تھے۔ سو ہمارے والدین کی دلی آرزو تھی کہ ہم "اُن" جیسے بن جائیں۔ ہم خود کیا ہیں اور کس تلاش میں سر گرداں ہیں اس پر کسی کو دھیان دینے کی نہ فرصت تھی نہ توجہ۔ سو ایک خلیج پیدا ہوتی چلی گئی۔ اسی سب کچھ کے دوران ہم نے میٹرک پاس کرلیا۔ نتیجہ آیا تو سب کی امیدوں کے برعکس ہم گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ کے اہل نہ ٹھہرے سو بامر مجبوری ہمیں ایف سی کالج داخل کروادیا گیا۔ ایف سی کالج کی دُنیا سکول سے بھی نرالی نکلی۔ ہم کیونکہ ہاسٹل میں رہتے تھے سو زندگی کا ایک نیا رُخ سامنے آیا۔ ایف سی کالج کے ہاسٹل کے اکثر ساتھی صاحب اقتدار حلقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ عوامی مزاج سے تو ہم سکول کے دنوں میں واقف ہوچکے تھے' اب جب خواص سے تعارف ہوا تو ایک اور سمندر سامنے تھا۔

محو حیرت تمام تماشہ دیکھا کئے۔ اس پر طُرہ یہ کہ ایف سی کالج پر جمیعت کا غلبہ تھا۔ سو دین کے نام پر سیاست کرنے والوں سے بھی واقفیت کا آغاز ہوا۔ ایک نئی دُنیا تھی اور نئے شب و روز۔ انہی شب و روز میں ہمیں ایک اور دوست مِلا ذیشان اعظم۔ ہم دونوں ہم جماعت نہ تھے اور ماسوا اس کے کہ اس کا تعلق بھی نارووال سے تھا ہمارے درمیان کوئی قدر مشترک بھی نہ تھی لیکن پھر بھی ہم ایسے قریب آئے کہ آج انیس برس بعد بھی الحمد للہ ہمارے دلوں کا تعلق برقرار ہے۔

ذیشان سے بہت کچھ سیکھا میں نے۔ سب سے بڑی بات جو سیکھی وہ یہ کہ کیسے اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے جنگل سے لاتعلق ہوا جاتا ہے۔ اپنے آدرشوں کو اپناتے ہوئے زندگی میں اپنا راستہ کیسے بنایا جاتا ہے۔ اس حوصلہ کے لئے میں ہمیشہ ذیشان کی دوستی کا مقروض رہوں گا۔ گرتے پڑتے ایف ایس سی پاس کی تو اگلا مرحلہ انجنیئرنگ یونیورسٹی کی تعلیم کا تھا سو ابتدء کی انجنیئرنگ یونیورسٹی ٹیکسلا سے۔ اس وقت تک میں لوگوں میں آدرش ڈھونڈنا چھوڑ چکا تھا۔ ان دنوں یونیورسٹیوں میں سیاست ہوا کرتی تھی۔

POWERED BY WORDPRESS | THEME BY MG12 | VALID XHTML 1.1 AND CSS 3 Log in

آؤ سنواریں پاکستان

ہمارا پیارا پاکستان

Home تعارف RSS feed

کچھ اتفاقات ایسے ہوئے کہ ہم بھی ان معاملات میں تھوڑے تھوڑے سے شامل ہو گئے۔ اللہ کا کرم یہ تھا کہ روز اول سے ہی ہماری شمولیت ایک طالبعلم کی سی . تھی۔

سو ہمارا زیادہ زور مشاہدہ پر تھا اور عملی سیاست میں شمولیت ماسوا ایک دو واقعات کے بہت کم تھی۔ ان دنوں میری شناسائی پاکستان کے اقتدار کے ایوانوں سے ہوئی۔ وزراء ممبران اسمبلی وغیرہ سے ملاقاتوں اور تبادلہ خیال کا موقع ملا۔ ان کے اصل خیالات اور ترجیحات کو دیکھا اور سمجھا۔ طبیعت مشاہداتی تھی سو خوب نتائج اخذ کئے۔

دو برس بعد میں نے اپنا تبادلہ لاہور انجنئیر نگ یونیورسٹی میں کروالیا لیکن ٹیکسلا کے برعکس یہاں میں نے سیاست سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کئے رکھی۔ اگلے دو برس تمام عمر کے مشاہدات کو جانچنے میں گزرے۔ اور پھر انجنئیرنگ کے بعد مزید تعلیم کے لئے امریکہ آ گیا۔

امریکہ آ کر ایک خوشگوار احساس ہوا۔ وہ اس لئے نہیں کہ ارد اگرد گوریاں پھرتی تھیں اور سہولیات میسر تھیں بلکہ اس لئے کہ زندگی میں پہلی دفعہ الفاظ اور آدرشوں کو کتابوں سے نکل کر انسانوں میں جیتا پایا۔ جہاں پاکستان میں ہر بندہ آپ کی بات کو جھوٹ سمجھتا ہے وہاں امریکہ میں ہر انسان کو دوسرے کو سچا سمجھتا پایا۔ یقین مانئے اسی بات پر کافی حیرت رہی کہ امریکہ میں کسی کو جھوٹا کہہ دینا اسے گالی دینے کے مترادف ہے اور کسی پر اگر جھوٹ ثابت ہو جائے تو اس کا تمام عمر کا اعتبار ختم ہو جاتا ہے۔ معاملات میں ایمانداری، خوش اخلاقی، خدمت خلق، اور ایسی کئی اوصاف جن کے متعلق ہمیں یقین تھا کہ کسی معاشرہ میں بحیثیت مجموعی موجود نہیں ہوں گی، انہیں یہاں موجود پایا۔

وہ تمام اسباق جو ہم متروک سمجھ چکے تھے، اس معاشرہ نے ان کے نہ صرف زندہ ہونے کا یقین دلایا بلکہ ان کی افادیت کا بھی احساس دلوایا۔ یہ ایک بہت بڑا مرحلہ تھا جس میں ہم نے علم و آدرش کو عمل میں ڈھلتے دیکھا۔

یہ جانا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فرمان کتنا صائب ہے کہ "علم بغیر عمل ایک آزار ہے۔"

یہ سمجھا کہ علم اگر عمل میں نہ ڈھلے تو بے فائدہ ہے اور یہ کہ اصل کامیابی رٹا لگانا یا لگوانا نہیں بلکہ اصل کامیابی سیکھے ہوئے پر عمل کرنا ہے۔

یہ کہ تعلیم کا مقصود ڈگری حاصل کرنا نہیں بلکہ ایک اچھا انسان بننا ہے

اور جو قوم یا فرد اس بنیادی نکتہ کو ذہن میں نہیں رکھتے، وہ کبھی باعزت نہیں ہو سکتے۔

اگر مجھ سے پوچھیں تو اسی ایک جملے میں پاکستان کا ماضی، حال اور مستقبل مقید ہیں۔

یوم پکوان

اس ویک اینڈ پر ہم فلوریڈا سے کنیکٹی کٹ کے دورے پر نکل کھڑے ہوئے اور اس قریباً تیرہ سو میل لمبے سفر کے دوران ماسوا ٹریفک کے اور کسی چیز پر دھیان دینے کی فرصت ہی نہ ملی۔ سو باقی کے دو ایام کی طرح یوم پکوان بھی ہم سے چھوٹا۔ خیر امید ہے کہ تھوڑی سی بے ایمانی تو اس معاملہ میں حلال ہی سمجھی جائے گی سو کچھ دیری کے ساتھ سہی انگلی کٹوا کے شہیدوں میں شامل ہونے کو آن موجود ہیں۔

کچھ بہن بھائیوں کو یہ علم تو اب تک ہو گا ہی کہ ہم کھانا کھانے اور پکانے کے کچھ حد تک شوقین ہیں۔ اس کا ثبوت کچھ تو آپ کو یہاں مل جائے گا اور باقی کے لئے اس تحریر کو آخر تک پڑھنے کی اذیت برداشت کیجئے۔ کیونکہ مابدولت ٹیکنالوجی کنسلٹنٹ ہیں سو بغرض معاش ہر ہفتہ فلوریڈا سے کنیکٹی کٹ بذریعہ اڑن کھٹولا تشریف لاتے ہیں۔

اس سفر کی غرض سے سوموار سے جمعرات تک ہمارا قیام ہوٹل میں رہتا ہے۔ اب امریکہ میں ہی نہیں دُنیا میں ایسے ریستوران بہت کم ہیں جہاں ہماری مرضی کا کھانا بنتا ہو اور ہماری مرضی کے وقت دستیاب ہوتا ہو۔

سو گذشتہ کچھ ہفتوں سے ہم ہلٹن کے ہوم ووڈ سویٹس میں مقیم ہوتے ہیں اور قریباً ہر روز شاہی مطبخ میں شاہی پکوان تیار کر کے بقلم خود کھاتے ہیں اور اپنے آپ کو داد و ہش سے فیضیاب فرماتے ہیں۔

پچھلے چند ہفتوں کے دوران ہمارے ہاتھوں جو چند شعبدے وارد ہوئے ان کا ہم آپ کو دیدار کروائے دیتے ہیں۔

تراکیب اس لئے نہیں بتائیں گے کہ ہم اکثر کھانا پکاتے ہوئے تجربات کرتے رہتے ہیں اور ویسے بھی ہم نے ابھی تک ایک چائے کا چیچ اور ایک چھٹانک جیسے پیمانوں کا استعمال شروع نہیں کیا۔ ہماری تراکیب کا عنصر اعظم تو "حسب ذائقہ" ہی ہے۔ یہ ہم نے مرغ بنایا تھا سادہ سا۔ ہمارا اس ہوٹل میں پکانے کا یہ پہلا تجربہ تھا سو ایک نسبتاً آسان سی چیز کا انتخاب کیا۔

اجزائے ترکیبی میں ایک عدد مرغ، پیاز، ٹماٹر، لہسن، تیل، پانی اور ہرا دھنیا شامل تھے۔ اگلے روز سوچا کہ مرغ کو ایک تھوڑے سے منفرد انداز سے بنایا جائے سو اپنی من پسند کڑاہی بنانے کی ٹھانی۔ امریکہ میں جو کڑاہی کے نام پر بھُنے ہوئے مرغ کی عجیب و غریب اقسام بیچی جاتی ہیں، ان سے ہمارا دل تو بیزار ہے سو اگر کڑاہی کھانے کو جی چاہے تو عموماً خود ہی بنایا کرتے ہیں۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں مرغ، ادرک، ہری مرچ، لہسن، دہی، ٹماٹر، پیاز اور کالا زیرہ شامل تھے۔

GOSHA-E-BLOGGERS URDU LIBRARY اردو لائبریری گوشۂ بلاگرز

POWERED BY WORDPRESS | THEME BY MG12 | VALID XHTML 1.1 AND CSS 3 Log in

آؤ سنواریں پاکستان

ہمارا پیارا پاکستان

Home تعارف RSS feed

کیونکہ ابھی ہمیں چولہے سے واقفیت نہ تھی سو یہ کڑاہی ہماری حسب منشاء تو نہ بنی لیکن بہر حال ایسی بُری بھی نہ تھی کہ کھائی نہ جاتی۔ پھر خیال آیا کہ اب کے مرغ کو ذرا منفرد انداز سے پکائیں۔ سو یہ شاہکار تخلیق ہوا۔ بالکل سادہ سی ترکیب کے ساتھ بنایا یہ مرغ اور ہری مرچوں کے ساتھ اس کا مزا دو آتشہ ہو گیا۔ ساتھ تناول کئے سادہ چاول اور شکر کیا پروردگار کا کہ جس نے بھوک میں کھانا کھلایا۔ ایک روز جی آیا مرغ چنے پکانے پر۔ ارادہ تھا کہ چنوں میں شوربہ نہ ہو۔ بس "چکڑ چھولے" جیسی کوئی چیز بنے۔ سو پہلے مرغی کو بھونا، اور پھر قریباً دس منٹ پہلے چنے ڈال کر انہیں تھوڑا سا دم دیا اور آخر میں پانچ منٹ مزید بھونا تو یہ شاہکار تخلیق ہو گیا۔ اس کو سجانے کا کام ابھی ادھورا ہے اور اس کے لئے مختلف انداز سوچے جا رہے ہیں۔ اگر آپ میں سے کسی کے ذہن میں کوئی خیال ہے تو ضرور فرمائیں۔ اگر کسی دستر خوان پر بریانی موجود نہیں تو وہ دستر خوان ہی نامکمل ہے۔ سو یہ بریانی پیش خدمت ہے۔ مرغ کی بریانی مرغ، زیبرا کے چاول اور شان کے مصالحہ کے ساتھ بنی تھی۔ شان کا مصالحہ اس لئے استعمال کیا کہ اب یہاں اتنے سارے مصالحہ جات ڈھونڈنے کا جھنجھٹ کون کرے۔ پکانے کی ترکیب البتہ کلیتاً ہماری اپنی کہ ہمیں مصالحوں کے ڈبوں پر لکھی تراکیب سے بھی اختلاف رہتا ہے اور ویسے بھی ان پر عمل کرنے سے کھانے کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔ پچھلے ہفتے ہم نے اپنے دفتر کے ساتھیوں کی دعوت کی اور انہیں مرغ بریانی پکا کر کھلائی۔ اگر کسی کھانے کی پسندیدگی کا اشاریہ اس کا ختم ہو جانا ہے تو پھر ہماری بریانی کو ساتھیوں کی پسندیدگی کی سند مل گئی تھی۔ امید ہے کہ ان کھانوں کی تصاویر نے آپ کے روزہ کے ثواب میں مزید اضافہ کیا ہو گا۔ البتہ اگر کسی بے صبرے نے انہیں دیکھ کر بے قراری میں روزہ خوری کر لی تو ما بدولت اس کے گناہ سے معصوم ہیں۔

ٹیگ ہی ٹیگ

سب سے پہلے تو راشد کامران کا شکریہ کہ انہوں نے ہمیں ٹیگ کر کے ہمارے اس کھیل میں شامل ہونے کے عزم کو جِلا بخشی۔ اور پھر شگفتہ بہنا کا شکریہ کہ ایک بار پھر تحریک دلا کر خود رفوچکر ہو گئیں۔ اس سب تمہید کے بعد اب چلتے ہیں سوال و جواب کی جانب۔ کیونکہ یہ نہیں بتایا گیا کہ کس سوال کے کتنے نمبر ہیں سو نتائج میں دھاندلی کے واضح امکانات ہیں لیکن پھر بھی جیسے ہر سیاسی جماعت دھاندلی کے یقین کے باوجود انتخابات میں حصہ لیتی ہے اسی طرح ہم بھی ان کے نقش قدم پر ٹہلتے ہوئے ان سوالات کا جواب دیئے دیتے ہیں۔

آؤ سنواریں پاکستان

ہمارا پیارا پاکستان

سوالات :

.1آپ کا نام یا نک؟ اگر اصل نام شیئر کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔

محمد خرم بشیر بھٹی

.2آپ کے بلاگ کا ربط اور بلاگ کا نام یا عنوان؟ بلاگ کا عنوان رکھنے کی کوئی وجہ تسمیہ ہو تو وہ بھی شیئر کر سکتے ہیں۔

بلاگ کا ربط تو یہی ہوا جہاں آپ یہ تحریر پڑھ رہے ہیں۔ عنوان ہے "آؤ سنواریں پاکستان"۔ وجہ تسمیہ یہ کہ کوئی تین برس قبل یہ ڈومین رجسٹر کروائی تھی۔ ارادہ تھا کہ پاکستان کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی موضوعات پر تبادلہ خیال کا ایک پلیٹ فارم بنایا جائے۔ تین برس بعد وہ پتھر تو بنا چومے چھوڑ دیا لیکن اتفاقاً بلاگ کی دُنیا سے شناسائی ہوئی تو سوچا کہ اس طریق پر بھی اپنی بات پہنچائی جا سکتی ہے۔ وگرنہ دل کا غبار تو نکالا ہی جا سکتا ہے۔

.3آپ کا بلاگ کب شروع ہوا؟

6جولائی 2009 کو

.4آپ اپنے گھر سے کون سے ایک، دو یا زائد لوگوں کو بلاگنگ کا مشورہ دیں گے یا دے چکے ہیں؟ ربط پلیز

میں اتنا احمق نہیں جتنا دکھتا ہوں۔ کچھ باتیں گھر کی چاردیواری کے اندر ہی رہیں تو بہتر ہے۔

.5 کوئی ایک، تین یا پانچ یا زائد ایسے موضوعات جن پر لکھنے کی خواہش ہے مگر ابھی تک نہیں لکھ سکے یا آئندہ لکھنا چاہیں؟

ایسی تو کوئی بات نہیں۔ جس وقت جو دل میں سمائے لکھ ڈالتا ہوں سوالحمد للہ نہ کوئی حسرت ہے اور نہ کوئی آئندہ پروگرام۔ بس یہ خواہش ہے کہ جو بھی لکھوں کسی مقصد کے لئے لکھوں۔

.6آپ کا بلاگ اب تک کس کی بدولت فعال یا زندہ ہے؟ آپ خود یا کوئی دوسرا نام؟ (مؤخرالذکر کی صورت میں نام بھی لکھ دیں۔ اگر ربط دیا جا سکتا ہے تو ربط بھی)

بلاگ پڑھنے والے مہربانوں کی وجہ سے وگرنہ مجھ میں اتنی مستقل مزاجی نہیں۔

.7اپنے موبائل سے کم از کم کوئی ایک، تین یا پانچ اچھے ایس ایم ایس شیئر کریں

موبائل سے ایس ایم ایس عموماً صرف ایک ہستی کرتی ہے۔ چند ایک ایس ایم ایس لکھے دیتا ہوں

GE والے مائیکرو ویو ٹھیک کرنے آئے ہیں۔

امل کے خاوند سے اس کا نمبر دوبارہ پوچھئے۔ پُرانا نمبر پھر کام نہیں کر رہا۔

ایک جوتا اچھال رہا ہے۔ خرید لوں؟

کدھر غائب ہیں؟

وغیرہ وغیرہ

8. آپ کی اردو زبان سے دلچسپی کس نام کے سبب سے ہے؟ (استاد؟ گھر کا کوئی فرد؟ یا کوئی دوسرا نام؟ یا کوئی الگ وجہ؟(

پہلی زبان ہے جو بولنا اور لکھنا پڑھنا شروع کی سو مافی الضمیر بیان کرنا آسان ہے۔ ویسے بھی جب مخاطب پاکستانی ہیں تو زبان بھی پاکستان کی ہی بولنا چاہیے۔

9. کیا آپ اردو بلاگ دنیا روزانہ وزٹ کرتے ہیں اور مختلف بلاگز کسی ترتیب سے وزٹ کرتے ہیں یا جو بھی بلاگ سامنے آ جائے؟ اپنا بلاگنگ روٹ شیئر کریں۔

جن احباب کے بلاگز کی آر ایس ایس دستیاب ہے انہیں تو ریڈر میں ڈال رکھا ہے۔ باقی اردو سیارہ قریباً روز ہی چکر لگا لیتا ہوں۔

10. آپ کے بلاگ پر پہلے پانچ یا دس تبصرہ نگار کون سے تھے؟

وارث بھائی، فہد بھائی، شگفتہ بہنا پہلے تبصرہ نگار تھے۔ پھر ڈفر، جعفر، اسماء بہنا، عنیقہ بہنا، افضل بھائی، عمر، عبداللہ بھائی، بی ٹی بھائی، اجمل انکل، راشد بھائی، یاسر بھائی، کامران بھائی، حجاب بہنا، ماوراء بہنا سب نے ہمت افزائی کی۔

11. ہفتہ بلاگستان یا اردو بلاگ دنیا سے مختلف تحریروں پر ہونے والے تبصروں میں سے چند دلچسپ یا مفید تبصرے شیئر کیجیے۔ ربط دینا نہ بھولیں۔

یہ مشکل کام ہے مجھ تن آساں سے نہیں ہونے کا۔

12. ہفتہ بلاگستان یا اردو بلاگ دنیا سے مختلف تحریروں سے منتخب جملے جو آپ کو پسند آئے ہوں یا جنہیں آپ تعمیری اور مفید سمجھیں۔ (اگر تعداد معین کرنا چاہیں تو تین، پانچ، دس یا جتنے مرضی)

چاند کا حسن اس کی تمام کرنوں سے مل کر بنتا ہے۔ الگ الگ کرنیں تو کوئی تاثر نہیں چھوڑ سکتیں سو جس نے جو لکھا کمال لکھا۔

13. ہفتہ بلاگستان کے بعد اب ہم "یوم بلاگستان" منایا کریں گے آپ کے خیال میں "یوم بلاگستان" ہر ہفتہ میں ایک دن منایا جائے یا ہر ماہ میں ایک دن منایا جائے؟

ہر ماہ میں ایک دن بہتر رہے گا ورنہ مجھ ایسے یا تو صرف خانہ پُری کریں گے یا پھر ڈُبکی لگا جائیں گے۔

14. مختلف بلاگرز کو کوئی شعر یا جملہ انہیں ٹائٹل کے طور پر منسوب کریں۔

GOSHA-E-BLOGGERS
گوشہ بلاگرز
URDU LIBRARY
اردو لائبریری

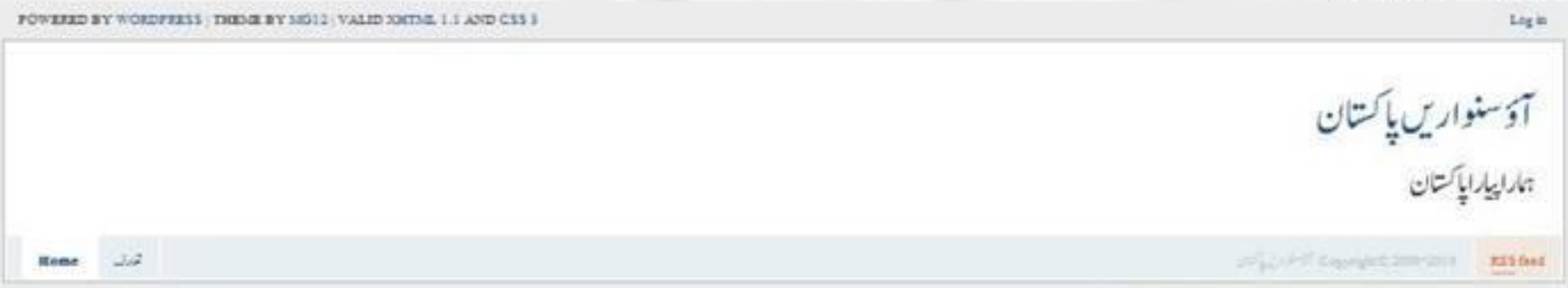

ابھی اتنا وقت نہیں ہے۔

15. ہفتہ بلاگستان اور بلاگ دنیا میں شامل تحریریں جو آپ کو پسند آئی ہوں؟

سب ہی اچھی ہوتی ہیں۔ چند ایک کی تخصیص کرنا مشکل ہے۔

16. ہفتہ بلاگستان اور بلاگ دنیا میں شامل کوئی بھی اپنی پسند کی تصاویر شیئر کریں جو بلاگرز کی اپنی فوٹو گرافی ہو؟ ربط ضرور دیجیے ۔

فوٹو گرافی کے کھیل میں دوستوں نے خوب اچھی تصاویر بانٹی ہیں۔

17. کن بلاگرز کو آپ کے خیال میں باقاعدگی سے لکھنا چاہیے؟

سب کو۔ یہ بلاگ دنیا ایک طرح سے مباحثہ اور تبادلہ خیال کا بہانہ ہی تو ہے۔ سو مینسا بن کر بیٹھے رہنے کی بجائے دل کھول کر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہیے اور وسعت نظر و ذہن کی کوشش کرنا چاہیے۔

18. بلاگ دنیا میں آپ اپنا کردار کس انداز میں ادا کرنا چاہتے ہیں یا کر رہے ہیں؟

چاہتا ہوں کہ جو لکھوں کسی مقصد کے تحت لکھوں۔ اگر میرے ٹوٹے پھوٹے الفاظ اور ناکارہ جذبے اس طرح تعمیر و تشکیل وطن کے کام آ سکیں تو سمجھوں گا تپیا سپھل ہوئی۔

19. ہفتہ بلاگستان کے بارے میں آپ کے تاثرات

بہت اچھا خیال تھا اگرچہ اسے پیش کرنے والی "قدم بڑھاؤ ساتھیو" کہہ کر خود پیچھے سے کھسک لیں۔

20. اس ٹیگ میں کوئی بھی ایک سوال اپنی جانب سے شامل کریں اور اس کا جواب بھی لکھیں

اگر انڈہ مرغی سے پہلے پیدا ہوتا تو دُنیا میں کیا فرق پڑ جاتا؟

جواب : پتہ نہیں

کچھ تصاویر اِدھر اُدھر سے

ہفتہ بلاگستان کے سلسلہ میں ایک کھیل تصویر کشی کا بھی رکھا گیا سو اس سلسلے میں کچھ تصاویر پیش خدمت ہیں۔

GOSHA-E-BLOGGERS
گوشۂ بلاگرز
اردو لائبریری
URDU LIBRARY

POWERED BY WORDPRESS | THEME BY MG12 | VALID XHTML 1.1 AND CSS 3

Log in

آؤ سنواریں پاکستان

ہمارا پیارا پاکستان

Home | تعارف | RSS feed

ڈزنی کی میجک کنگڈم میں خدیجہ اور میں نور اور اس کی اماں کا انتظار کر رہے تھے کہ خدیجہ کے ہاتھ میرے فون کا ہولسٹر آ گیا۔

POWERED BY WORDPRESS | THEME BY MG12 | VALID XHTML 1.1 AND CSS 3

Log in

آؤ سنواریں پاکستان

ہمارا پیارا پاکستان

Home تعارف RSS feed

اس روز ایپکاٹ میں بہت گرمی تھی اور نور کو پنکھا چلانے کا شوق پورا کرنے کا خوب موقع ملا۔

ریاست غربی ورجینیا میں پہاڑی دریا۔

خدیجہ پھولوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے۔

POWERED BY WORDPRESS | THEME BY MG12 | VALID XHTML 1.1 AND CSS 3
Log in

آؤ سنواریں پاکستان

ہمارا پیارا پاکستان

Home | تعارف | RSS feed

نور جنگل میں اپنی گیند کے ساتھ

ایک کچی سڑک

گلینا (الی نوائے) کا ایک منظر

چڑھتی صبح کی دھوپ کے کچھ مناظر

GOSHA URDU LIBRARY
اردو لائبریری